رخسانہ بی بی

''کئی چاند تھے سر آسماں'' اور ''غلام باغ'' میں کارفرما تاریخی تصورات کا تقابلی جائزہ

"Kaey Chand They Sar-e-Asman" by Shams ur Rehman Farooqi and "Ghulam Bagh" by Mirza Athar Baig are a valuable addition to fiction. Indo Islamic civilization of 18th century has been discussed in "Kaey Chand They Sar-e-Asman". On the other hand, existing conflict between the rulers and the masses in the era of colonization has been highlighted in "Ghulam Bagh" In this research article the comparative analysis of the both aforementioned novels has been highlighted in a new way.

اُردو ناول کی تاریخ کا دامن آغاز سے تا حال کئی اہم اور یادگار ناولوں سے مالا مال ہے۔ موضوعات اور تکنیک دونوں حوالوں سے اہم ناول منظر عام پر آئے اور اُردو کو ناول کے شعبے کو وقار حاصل ہوا۔ اِس ذیل میں ناول کی تکنیک، موضوعات اور فکر و فن پر کئی تنقیدی اور تحقیقی کتب چھپ چکی ہیں جن میں کونسا ناول، ناول کی اہمیت اور اچھوتے پن کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کی ثروت مندی اپنی جگہ لیکن اکیسویں صدی کا پہلا عشرہ بھی معیاری ناولوں سے خالی نہیں ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں ہی میں ایسے دو ناول منصۂ شہود پر آئے جن کی بدولت اُردو ناول کے وقار میں بے پناہ اضافہ ہوا اور ناول عالمی سطح کے ادب میں جگہ پانے کے قابل ہوا۔

پہلا ناول 'کئی چاند تھے سر آسماں' ہندوستان اور دوسرا ناول 'غلام باغ' پاکستان میں لکھا گیا لیکن ایک ہی سال میں چھپنے والے دونوں ناولوں میں فکری اور فنی حوالوں سے کئی مقامات پر مماثلتیں اور کئی جگہوں پر تضادات ملتے ہیں۔ اوّل الذکر ناول زمانی حوالے سے جہاں ختم ہوتا ہے۔ دوسرا ناول تقریباً وہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ دونوں ناول بیسویں صدی کے دو ملکوں اور دو معاشروں کی عکاسی اور ترجمانی کرتے ہیں لیکن مندرجات اور مشتملات کے حوالے سے ان میں تسلسل پایا جاتا ہے اور یہ بات خوش کن ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز بھی ہے اور قاری کی یہ حیرانی ہی تخلیق کو تکمیل کی منزل سے آشنا کرتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اور مرزا اطہر بیگ کو جدید اُردو ناول کے نمائندوں کے طور پر پیش کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ان ناولوں میں پانے والے، تاریخی شعور اور سماجی حقیقت نگاری کو قطعی طور پر فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ناول ایک عہد کے تخلیقی منظرنامے کے دو اہم حوالے ہی نہیں بلکہ مستقبل کے ناول نگار بھی خود ان ناولوں کی تکنیک، تاریخی، تنقیدی، تہذیبی و تمدنی اور سماجی شعور کی گرفت سے آزادی محسوس نہیں کریں گے۔ بڑی تخلیق اپنے عہد تخلیق ہی کی عکاسی نہیں کرتی بلکہ مستقبل کی تاریک راہوں کو بھی روشن کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اِس کی مثالیں ناول کے ساتھ ساتھ دوسری اصنافِ ادب میں بھی تلاش کی جاسکتی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی اور مرزا اطہر بیگ اُردو ناول کو جس مقام پر لے آئے ہیں۔ یہ آنے والے عہد کے ناول نگاروں کے لیے چیلنج ہے کہ وہ اتنے معیاری ناول کیونکر لکھ پائیں گے۔ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ ایک عہد کی تخلیق کی بڑی مچھلی، گرد و پیش کی دوسری تخلیقات کی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہے مگر یہ بات بلا خوف، تردید کہی جاسکتی ہے کہ مذکورہ دونوں ناول ایک ہی عہد (بلکہ ایک ہی برس) میں لکھی اور قبول عام کا درجہ حاصل کرنے والی دو اہم تخلیقات (ناول) ہیں۔

دو یا دو سے زیادہ تخلیقات جو یک موضوعی ہوں یا مختلف الموضوع، موازنہ یا تقابل کرنا اِس اعتبار سے درست معلوم نہیں ہوتا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ دو روشن چراغوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہاں چراغوں کی لو، سائز، روشنی وغیرہ کو ضرور زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔ زیرِنظر مقالے میں مذکورہ دونوں ناولوں کا میں نے اسی حوالے سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے اور اسے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا ہے۔ اس لیے (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں) کہ دونوں ناولوں میں کچھ اشتراکات اور کچھ اختلافات موجود ہیں۔ سو اس حقیقت کو مدنظر رکھے بغیر موازنہ یا تقابل نہیں ہوسکتا۔ میرا مقصد کسی ناول کو بڑا یا چھوٹا، اہم یا غیر اہم ثابت کرنا ہرگز نہیں۔ میں دراصل اکیسویں صدی کے ابتدائی حصے کے دو اہم ناولوں کا ایک ساتھ موضوعاتی، فنی اور فکری جائزہ لینا چاہتی ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ایک عہد میں سانس لینے والے دو بڑے ذہن کس طرح سوچتے اور ماضی پر نگاہ دوڑانے، گزرنے وقتوں کی عبارت کو پڑھنے کا انداز کیا ہے؟ اور تاریخ کے بارے میں اِن کا نقطہ نگاہ کیا ہے؟

کئی چاند تھے سر آسماں ناول کا عنوان احمد مشتاق کے اِس شعر سے مستعار لیا گیا ہے:

کئی چاند تھے سرِ آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے
نہ لہو مرے ہی جگر میں تھا نہ تمہاری زلف سیاہ تھی(۱)

ناول کو تاریخی حوالے سے دیکھیں تو یہ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے دور تک محیط ہے یعنی برصغیر کی صدیوں پرانی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور اس کی جگہ نئی انگریزی تہذیب اپنے قدم مضبوط کر رہی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب عظیم الشان مغل سلطنت سمٹ کر دہلی تک محدود ہوگئی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں انگریزی راج کا عروج ہو رہا تھا اور انگریز ملک پر قابض ہونے کے لیے ہر قسم کی سیاسی حکمت عملی اپنا رہے تھے۔

ناول کا مرکزی کردار وزیر بیگم ہے اور پورا ناول اس کی زندگی کے اردگرد گھومتا ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت ہے جو بے باک، بے خوف اور خود سر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے اپنے انفرادی وجود کا اس قدر احساس ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ خود کرتی ہے:

''سات ہی آٹھ برس کی تھی جب اسے اپنے حسن کی قوت اور اس قوت کو برتنے کے لیے اپنی بے نظیر اہمیت کا احساس ہو گیا تھا۔''[۲]

وزیر خانم کو مشرقی خواتین کے طور طریقے پسند نہ تھے جو شادی کے بعد زندگی بھر شوہر، ساس، اور بچوں کی خدمت کرے اور چولہے چوکے میں لگی رہتی ہیں۔ وزیر بیگم کی بہن جب اسے شادی کے لیے رضا مند کرنے کی کوشش کرتی ہے

تو ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے وزیر بیگم کے کردار کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے بڑی بہن سمجھاتے ہوئے کہتی ہے:

''عورت کے لیے مرد ضروری ہے، مرد کے لیے عورت ناموس ہے اور عورت کے لیے مرد وارث ہے۔''

''چلئے وارث ہی سہی۔ لیکن نکاح تو ضروری نہیں۔''

''تو کیا حرام کاری کرے گی؟ لڑکی خدا سے ڈر۔''

بس دو بول پڑھ دینے سے جو حرام تھا حلال ہو گیا؟

اور آپ کی بیٹی ان قصائیوں کی چھری سے حلال ہو گی تو وہ کچھ نہ ہوا باجی سن رکھو۔ میں شادی ہرگز نہ کروں گی، لیکن کرتی بھی تو ان موئے چپڑ قناتی خوچے والوں، ٹکڑ گدے قلا عوذی مولویوں، بھک منگے وظیفہ خوار نمائشی شریف زادوں سے تو ہرگز نہ کرتی۔''

اور نہیں تو کیا تیرے لیے کوئی نواب، کوئی شاہزادہ آئے گا۔؟''

''شاہزادہ تقدیر میں لکھا ہو گا تو آئے گا ہی نہیں تو نہ سہی۔

مجھے جو مرد چاہے گا اسے چکھوں گی پسند آئے گا تو رکھوں گی نہیں تو نکال باہر کروں گی۔''[۳]

آنے والے دنوں نے ثابت کیا کہ وزیر خانم نے جس مرد کو چاہا اس سے شادی کی شہزادہ بھی اس کا مقدر بنا البتہ فراغت اور سکون کے دن اس کی زندگی میں بہت کم آئے اس کردار کے ذریعے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ارادے کی مضبوطی اور کردار کی علوہمتی کے باوجود کچھ اور بھی ہے جو انسانوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور شاید یہی حالت اس مغلیہ تہذیب اور سلطنت کی بھی ہے جو وزیر خانم کی آنکھوں کے سامنے زوال کی منزلیں طے کر رہی تھی وزیر خانم کی طرح مغلیہ تہذیب بھی تمام خوبیوں کی حامل ہے۔

مغلیہ سلطنت اور وزیر خانم میں ایک طرح کی ہم آہنگی ہے اور دونوں ہی کو ہندوستانی تہذیب کے بدلتے ہوئے زوال آمادہ منظر کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔اور درج بالا شعر وزیر خانم کی زندگی پر بھی صادق آتا ہے اور مغلیہ سلطنت پر بھی اس لیے 'کئی چاند تھے سر آسماں' کا عنوان ایک تاریخی استعارہ ہے اور ایک ناول کے عہد اور موضوع کے حوالے سے اسے مغلیہ دور اور وزیر خانم کی زندگی کے آخری دور کا ایک بلیغ استعارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔'غلام باغ' کا عنوان بھی تاریخی استعارہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مرزا اطہر بیگ اس بارے میں کہتے ہیں:

''غلام اور باغ ایک دوسرے کی ضد ہیں باغ زندگی کی علامت ہے اور غلام اسیری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہی صورت حال ایک سطح پر ناول کی فضا بنتی ہے۔''[۴]

اب دیکھیں باغ زندگی کی، خوشیوں کی، آزادی کی علامت ہے جبکہ غلام اسیری کی غلبہ کی علامت باغ کی علامتی حقیقت دیکھیں تو اس میں مثبت قوتیں پروان چڑھتی ہیں اور ترقی اپنے عروج پر ہوتی ہے سوچ کے نئے دریچے کھلتے ہیں

ہر طرف خوشیاں خوشیاں ہوتی ہیں۔

ایک باغ جسے آزاد ہونا چاہیے اگر غلام بن جاتے تو اس کا حشر بہت بھیانک ہوتا ہے یعنی آج ہم آزاد ہوتے ہوئے بھی غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم اپنی سوچ میں اپنے افکار میں اپنے عمل میں آزاد نہیں اور آج بھی استعماری قوتوں کے شکنجے میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔

انسان کا انسان پر غلبہ اور دوسرے انسان کو محکوم بنانا اس بات کو اس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔ چنانچہ 'غلام باغ' کا عنوان بھی تاریخی حوالے سے دیکھیں تو استعارہ ہے۔ ایک ایسی قوم کا ایک ایسے ملک کا جو استعماری قوتوں کے شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے اور اس کے بظاہر بااختیار لوگ بھی اپنے فیصلوں میں اور اپنی سوچوں میں آزاد نہیں اور اپنے نفس کے غلام ہیں۔

انگریز آج یہاں پر نہیں ہے ساٹھ ستر سال ہوئے ہمیں آزادی ملے ہوئے لیکن ہم ان کی دی ہوئی غلامی کی فضا میں آج بھی سانس لے رہے ہیں اور ان کی قید سے چھٹکارہ نہیں پا سکے۔ کیونکہ انہوں نے ہماری سوچ کو جکڑا ہوا ہے ہمارے پاس اپنا کچھ بھی نہیں چنانچہ 'غلام باغ' کا عنوان بھی اپنے موضوع اور عہد کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل بھی ہے اور تاریخی علامتی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ نو آبادکاروں نے ہمیں جو سوچ دی اس کے مطابق ہم آج بھی زندگی گزار رہے ہیں کیونکہ آج بھی ان کی غلامی سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔

'کئی چاند تھے سر آسماں' کا عہد تاریخی اعتبار سے اٹھارویں اور انیسویں صدی کی زوال پذیر مغل حکمران تہذیب پر مبنی ہے اس میں مغل حکمرانوں کے اس خاص عہد کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جب انگریز ہندوستان پر پوری طرح حاوی ہو رہے تھے اور مغل حکومت کا دِیا تقریباً بجھنے کے قریب تھا اور برصغیر کی صدیوں پرانی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور اس کی جگہ انگریزی تہذیب اپنے قدم مستحکم کر رہی تھی۔ یہ عہد وہ عبوری دور ہے جب نئی و پرانی نسل نئی تہذیب کو اپنانے میں لیس و پیش کر رہی تھی۔ امجد طفیل روزنامہ اوصاف میں 'کئی چاند تھے سر آسماں' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''کئی چاند تھے سر آسماں بجا طور پر تہذیبی تاریخ کو تخلیقی انداز سے پیش کرنے کی کوشش ہے..... مکانی اعتبار سے یہ ناول کشمیر، لاہور، راجپوتانہ، فرخ آباد اور دہلی کے علاقوں پر محیط ہے اور لسانی اعتبار سے ۱۷۵۰ء سے ۱۸۵۰ء تک کے درمیانے سو سالوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس ناول کا مکانی علاقہ تو یوپی ہے ہند اسلامی تہذیب میں اٹھارویں صدی ہی سے یورپی تہذیب کے تال میل کے سبب تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں۔ ان تبدیلیوں کے واضح آثار رونما ہونے لگے تھے۔ یہ ناول اس ساری صورت حال کو کرداروں کی زباں میں پیش کرتا ہے۔''[۵]

چنانچہ 'کئی چاند تھے سر آسماں' کا عہد اور موضوع دونوں تاریخی ہیں اور اس ناول میں خاص عہد کو موضوع بنایا گیا ہے جو تاریخی اعتبار سے انتشار اضطراب اور کشمکش کا دور ہے اس طرح اس کا عہد اور موضوع بھی تاریخی حوالے سے اہمیت کا حامل ہے اور جس عہد کو موضوع بنایا گیا ہے وہ موضوع یقیناً حقیقی اور تاریخی اعتبار سے مستند حیثیت رکھتا ہے۔ 'غلام

باغ' کا عہد موجودہ زمانہ ہے اس میں نو آبادیاتی ماحول کو پیش کیا گیا ہے لیکن پھر اس کا تعلق یکدم حال سے جوڑا گیا ہے کہ برصغیر پاک و ہند کا انسان نو آبادیاتی نظام سے نکلنے کے بعد آج کس مقام پر کھڑا ہے۔

اس کا عہد انگریزوں کی ہندوستان میں حکومت قائم ہونے سے شروع ہوتا ہے اور آج تک بلکہ آنے والے زمانے تک محیط ہے اور اس کا موضوع بھی کسی مخصوص عہد سے تعلق نہیں رکھتا بقول سہیل احمد خاں:

'غلام باغ بہت وسیع دائرے کا ناول ہے اس میں ماضی کی آسیبی پرچھائیاں، حال کی بے ترتیبی اور مستقبل کا الجھاؤ ایک دوسرے سے متصادم دکھائی دیتے ہیں۔''[۶]

اس اقتباس سے غلام باغ کے موضوع و عہد کا تعین ہو جاتا ہے کہ یہ ناول تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے اور نو آبادیاتی اور مابعد نو آبادیاتی دور کا بیان اِس میں ملتا ہے جو ایک اہم دور ہے۔

'کئی چاند تھے سر آسماں' کا عہد و موضوع ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک کا ہے جبکہ غلام باغ کا عہد یہاں سے شروع ہو کر حال تک کو محیط ہے 'کئی چاند تھے سر آسماں' میں ہندوستان کی مٹتی ہوئی تہذیب کا عکس دکھایا گیا ہے اور ایک خاکستر ہوتی تہذیب کے زوال، ابتذال اور شکست و ریخت کو موضوع بحث بنایا گیا ہے جبکہ 'غلام باغ' میں اس مٹتی ہوئی تہذیب کے بعد کے اثرات اور پھر استعماری شکنجوں سے آزادی کے بعد کی آج کی زندگی کا عکس ہے جس میں انسان آزاد ہوتے ہوئے بھی غلامی کی زندگی گزار رہا ہے اور اس زندگی کی افراتفری اور انتشار کا بہت انوکھے انداز سے نقشہ کھینچا گیا ہے جو یقیناً قابل ستائش ہے۔ مرزا اطہر بیگ روزنامہ 'ایکسپریس' کو دیئے گئے انٹرویو میں کہتے ہیں:

''ناول میں نو آبادیاتی دور کے بعد کو ہی نہیں پہلے کے دور کو بھی بیان کیا ہے۔ نو آبادیاتی دور کا جو عہد چنا ہے ۱۸۶۰ء کے قریب کا دور ہے جب انگریز پوری طرح یہاں قدم جما چکے تھے اور اسی دور میں تہذیبی اور تعلیمی ادارے بھی تشکیل پا رہے تھے نو آبادیات کے بعد جو جبر اور ذلت کی شکلیں یہاں رائج رہیں اس کا احوال بھی آپ کو ملتا ہے۔''[۷]

چنانچہ عہد اور موضوع کے حوالے سے دونوں ناول انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ ناولوں میں 'کئی چاند تھے سر آسماں' کا عہد زوال پذیر مغلیہ حکومت کا عہد ہے یہ گھن کھاتی ہوئی تہذیب کی واضح نشانی ہے اور اس ناول میں مغلیہ حکومت کے خاتمے سے پہلے کے زمانے اور اس زمانے کی بدعنوان شخصیات کا انتخاب شاید اسی لیے کیا ہے کہ وہ زوال کی نشاندہی کر سکیں اس کے ساتھ ساتھ اس ناول میں ہند اسلامی کلچر یا مخلوط تہذیب اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی باشندوں کے درمیان پائی جانے والی یگانگت و رواداری کو مختلف زاویوں سے اجاگر کیا گیا ہے یہ تمام چیزیں اس کے موضوع کا اہم حصہ ہیں جب شمس الدین ولیم فریزر کے قتل میں ملوث ہوتے ہیں اور انہیں یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ انہیں سزا ہو گی تو ایک عمر رسیدہ سکھ اجاگر سنگھ ان کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے:

''میں آپ کے والد ماجد بڑے نواب صاحب کے زمانے میں ان کا خاص پرکارہ تھا ان کے سرگباش ہونے کے کچھ دن پہلے میں نواب کی ملازمت سے وظیفہ حسن خدمت لے کر وطن واپس چلا گیا تھا اور آج صبح خبر سن

کر گاؤں سے دوڑ ا چلا آیا ہوں..... سر کار کا اقبال بلند رہے میری سانڈنی سوکوس سے ادھر دم لینے والی نہیں۔'' اس نے عرض کی۔'عالی جاہ چند مدت کے لیے میرا لباس پہن لیں اور سانڈنی میری پر سوار ہو کر آج ہی رات سکھوں کے ملک کے لیے نکل چلیں میں واہے گورو کی قسم کھا کر کہتا ہوں سرحد پر میری قوم کے لوگ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور پورے عزت اور آبرو سے آپ کو لاہور کے قلعے میں پہنچا دیں گے۔''[۸]

اس طرح بادشاہ ثانی اور مہاراجی سندھیا کے باہمی تعلقات کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہے مہاراجی سندھیا کو بادشاہ نے 'فرزند دلبند' کا خطاب دیا اور اس کے ساتھ نائب السلطنت بھی مقرر کیا جو کہ اہم اور غیر معمولی بات تھی۔اس کے علاوہ محرم کی مجلسوں اور عزاداری میں ہندو، سنی شیعہ سبھی شریک ہوتے ہیں اور مل کر نوحے پڑھتے ہیں ماتم کرتے ہیں یہاں ناول میں برصغیر کی ہند اسلامی تہذیب و ثقافت کی یکجہتی کو واضح کیا گیا ہے۔

جبکہ 'غلام باغ' میں بتایا گیا ہے کہ آج کا انسان اخلاقی طور پر کس قدر گر چکا ہے استعماری شکنجوں میں جکڑا آج کا انسان بظاہر آزاد ہے لیکن حقیقی طور پر اپنے نفس کا غلام ہے اور استعماری قوتوں نے ہمارے ذہنوں کو اس قدر غلام بنا رکھا ہے کہ ہم غلامی کے خول سے باہر نہیں نکل پا رہے اور دوسرے مذاہب تو بہت دور کی بات ہم مسلمان یہاں تک کہ خون کے رشتے بھی اپنی پہچان کھو چکے ہیں ہر طرف صرف اور صرف ترجیحات کا معاملہ ہے زہرہ کا تعلق اپنے بھائیوں اور ماں کے ساتھ ایسا ہی ہے۔عطائی کی وفات کے بعد وہ بالکل اکیلی ہو جاتی ہے اس کی ماں اور بھائی اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ ہی نہیں پاتے اور وہ صرف اپنی شان و شوکت اور مرتبہ کے چکر میں رہتے ہیں اور وہ اپنی ماں اور بھائیوں کو کبھی اپنا نہیں سکتی۔ماں اور بھائیوں کے ساتھ اس کے تعلقات کے بارے میں جاننے کے لیے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''عارفہ بیگم کے خیال کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور پھر سے شروع ہوا تو اس کی سمت بدل گئی..... بڑا بیٹا دوپہر کے کھانے میں نہ آ سکے گا اور کھانے کی میز پر اُسے پھر اُن دو عورتوں کے ٹھنڈے چہرے دیکھنے کو ملیں گے جن میں سے ایک اس کی بہو ہے اور دوسری بیٹی اور دونوں اس سے نفرت کرتی ہیں۔مگر کیا وہ زہرہ کے بارے میں یقین سے ایسا کہہ سکتی ہے کہ وہ اس سے نفرت کرتی شاید نہیں..... بیرونی دروازے کے پاس سے کار کے ہارن کی آواز آئی۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا اور اُس گھر کا ڈرائیور زہرہ کے بھائی کو گاڑی میں بٹھائے اندر داخل ہوا پچھلی نشست پر بیٹھے اُس بھاری بھرکم گورے چٹے نوجوان، 'کاروباری بھائی آدمی'، نے اپنی گولڈ فریم کی گول شیشیوں کی عینک سے گھر کے وسیع سبزہ زار کو پانی میں ڈوبا ہوا دیکھا ناپسندیدگی کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی باہر سڑکیں بھی اگرچہ غلیظ پانی اور کیچڑ میں ڈوبی تھیں مگر پتہ نہیں کیوں اُسے یقین تھا کہ اُس کے گھر کے اندر کے کھلے حصے پر اُس اچانک ٹوٹ برسنے والی بارش کا کچھ اثر نہ ہو گا مگر ایسا نہ تھا بارش ہر جگہ ایک جیسی ہی برستی تھی۔''[۹]

''غلام باغ'' میں نو آبادیاتی دور سے نکلنے کے بعد آج کے انسان کی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ کتنا خود غرض ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بے بس بھی 'کئی چاند تھے سر آسماں' میں موجود ہند اسلامی مخلوط ثقافت کیسے کمزور ہوئی اور مختلف

فرقوں ، گروہوں اور مذاہب کے لوگ ایک دوسرے سے کیسے متنفر اور خون کے پیاسے ہو گئے 'غلام باغ' میں اس کے اثرات بتائے گئے ہیں یعنی استعماری قوتوں نے ہندوستان کو ہر طرح سے نقصان پہنچایا اور ان کی سو سال کی حکومت نے برصغیر سے تمام روایات تہذیب و ثقافت چھین لی اور ہم آج تک ہم ان کے شکنجوں میں پھنسے ہوئے ہیں انہوں نے ہمارے اخلاق، اقدار تہذیب مذہب یہاں تک کہ رشتوں کو بھی متاثر کیا ہے اور اسی کے اثرات 'غلام باغ ' میں ملتے ہیں۔یعنی 'کئی چاند تھے سر آسماں' میں برصغیر کے زوال پذیر ہونے تک کا عہد کا بیان ملتا ہے اور اسی تہذیب کو موضوع بنایا گیا ہے تو 'غلام باغ' میں زوال پذیر نو آبادیاتی دور سے نکلنے کے بعد کے انسان پر اس کے اثرات کا تذکرہ بہت عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔چنانچہ دونوں ناولوں کا عہد اور موضوع اگرچہ ایک جیسا نہیں 'کئی چاند تھے سر آسماں' کا موضوع اور عہد اٹھارویں سے انیسویں صدی کی زوال پذیر تہذیب کا دور ہے یہ عرصہ ۱۸۵۷ء تک کو محیط ہے جبکہ 'غلام باغ' کا عہد اور موضوع ۱۸۵۷ء سے زمانہ حال تک ہے بلکہ اس میں زمانہ مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں ملتی ہیں اس کا دائرہ کار وسیع ہے۔

پہلے ناول میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے زوال پذیر معاشرے کی وجوہات اور حالات و واقعات کا بیان ملتا ہے آخر الذکر میں زوال کے بعد نو آبادیاتی دور اور پھر اس سے نکلنے کے بعد آج کی صورت حال کا ذکر ملتا ہے۔اگر ان دونوں ناولوں کے پلاٹ کے حوالے سے بات کی جائے تو دونوں میں تضاد ہے۔ پلاٹ کو ناول میں خاص اہمیت حاصل ہے اگر کہانی کو روح کہا جائے تو پلاٹ اس کا جسم کہلائے گا ناول کا پلاٹ حالات و بیان اور واقعات کی کلاسیکی تنظیم ہے دوسرے لفظوں میں حالات، واقعات کو تسلسل سے بیان کرنا پلاٹ کہلاتا ہے مثلاً پہلے ایک واقعہ پھر دوسرا ، پھر تیسرا یعنی تمام واقعات منطقی ترتیب سے بیان کیے جاتے ہیں۔'کئی چاند تھے سر آسماں' کا پلاٹ ان تمام معیارات پر پورا اترتا ہے بقول فیروز عالم :

> ''کئی چاند تھے سر آسماں کا پلاٹ اس قدر مربوط ہے کہ ایک باب کے ختم ہوتے ہوتے اس میں سے دوسرے باب کا پس منظر طلوع ہوتا دکھائی دینے لگتا ہے قصے کا تانا بانا کچھ اس طرح کا ہے کہ قاری کا تجسس ہمہ وقت برقرار رہتا ہے اور یہ سوچتے ہوئے ورق گردانی کرتا رہتا ہے کہ دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ دوسرے بہت سے ناولوں کی طرح آپ محض ادھر ادھر سے پڑھ کر نہیں سمجھ سکتے اس کا سبب ہے وہ تسلسل جس نے پورے ناول کو ایک سڑی میں پرو رکھا ہے۔''[۱۰]

اس ناول کا پلاٹ ایک عہد کی تہذیب اور ثقافت پر مبنی ہے تمام کردار اور واقعات ناول کے پلاٹ سے مطابقت رکھتے ہیں آغاز میں کہانی موجودہ زمانے سے شروع ہوتی ہے اور دستاویزات سے ناول کا آغاز ہوتا ہے اور پھر وسیم جعفر جو وزیر بیگم (ناول کا مرکزی کردار) کے پڑنواسے ہیں اور انہیں اپنے آباؤ اجداد کے بارے میں معلومات چاہیں اس کے بعد وزیر بیگم کے پردادے مخصوص اللہ سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے اور پلاٹ منطقی ربط و تسلسل سے آگے بڑھتا ہے اگرچہ بعض جگہ جزئیات کی وجہ سے تفصیلات کا بہت زیادہ بیان ملتا ہے لیکن اگر غور کریں تو یہ تمام تفصیلات بے معنی نہیں یہ وہ تفصیلات

ہیں جو چار نسلوں کے حوالے سے سامنے آئی ہیں بقول مظہر جمیل:

''فکشن میں بہت سی باتیں فضا سازی اور کہانی کے منظر نامے میں وقت کی گہرائی اور دبازت پیدا کرنے کے لیے بھی بیان کی جاتی ہیں جسے عرف عام میں ابعادی تاثر (Dimentional effect) کا نام دیا جاتا ہے یہاں ان تفاصیل کو جہاں معاشرتی تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کو اجاگر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے وہیں ان تفصیلات سے وقت رواں (Time sequence) زمینی وابستگی مقامات موقوعہ اور لوکیل (Locale) کے درمیان ربط وتسلسل قائم کرنے کا کام بھی لیا گیا ہے۔''[۱۱]

پلاٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جتنا تاریخی ہوگا اتنا ہی ناول کامیاب ہوگا تو اس حوالے سے ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کا پلاٹ مربوط، منطقی اور تاریخی ہے اور پلاٹ کے تانے بانے نہایت مہارت سے لیے گئے ہیں۔'غلام باغ' کے پلاٹ میں منطقی ترتیب نہیں ملتی یہ ناول اُتار چڑھاؤ کی صورت میں آگے بڑھتا ہے اِس میں کئی مدوجزر ملتے ہیں اس ناول میں واقعات آگے جاتے ہیں ختم ہوتے ہیں پھر پیچھے آتے ہیں پھر آگے بڑھتے ہیں'غلام باغ' میں اس تکنیک کو استعمال کیا گیا ہے جس میں پلاٹ اتنا اہم نہیں ہوتا اس میں اُردو ناول کے روایتی انداز سے ہٹ کر نئی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔رضی عابدی 'غلام باغ' کی کہانی کے بارے میں تبصرہ کچھ یوں کرتے ہیں:

"The story is neither a linear narrative nor does it follow the tech techniques of the stream of consciousness or impressionism. At one level it is a study of predicament of the individuals in the modern world. In a way the study can be seen as a juxtaposition of soliloquies." [۱۲]

غلام باغ میں جو تکنیک استعمال کی گئی ہے اردو میں اس کی روایت نہیں ملتی،عبداللہ حسین ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غلام باغ '' اپنے مقام میں اردو روایت سے قطعی ہٹ کر ہے بلکہ انگریزی ناول میں بھی یہ تکنیک نا پید ہے اس کے ڈانڈے یورپی ناول خاص طور پر فرانسی پوسٹ ماڈرن ناول سے ملتے ہیں۔''[۱۳]

چنانچہ'غلام باغ' میں پلاٹ منظّم صورت میں نہیں بلکہ اس کے واقعات و حالات بکھری ہوئی صورت میں ہیں اس کی کہانی میں افراتفری اور بے ربطی موجود ہے۔اس حوالے سے رضی عابدی کچھ یوں تبصرہ کرتے ہیں:

"As such there seems to be no story in the novel, if a story has a beginning, a middle and an end. However, it is built on a number of stories thrown haphazardly here and there. While this shows the prevailing chaos, aspiring to Hermaphrodite." [۱۴]

گویا'غلام باغ' عام روایت سے ہٹ کر لکھا گیا ہے اور اس کی تکنیک یورپی ناول خا طور پر فرانسی ناول سے ملتی

ہے یہ اور نئے دور کی شروعات سے ناول میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ وہ اِس ناول میں بھی موجود ہیں۔ اِس طرح یہ اُردو ناول میں گراں قدر اضافہ ہے۔

'کئی چاند تھے سر آسماں' کے کردار تاریخی اور حقیقی ہیں اور ہر کردار ایک طرز زندگی کا نمائندہ ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار وزیر خانم کا ہے جو بہت جاندار کردار ہے اس کردار سے متعارف ہونے سے پہلے بنی ٹھنی سے متعارف ہوتے ہیں اور بنی ٹھنی ہی اصل میں وزیر خانم ہے۔ وزیر خانم داغ دہلوی کی والدہ ہیں جو اردو کے ممتاز شاعر تھے داغ اُردو کی کلاسیکی شاعری میں ایک الگ اہم مقام رکھتے ہیں۔ ناول کی پوری کہانی وزیر خانم کی زندگی کے گرد گھومتی ہے یہ ایک ایسا کردار ہے جو ہے تو حقیقی اور تاریخی مگر پہلے یہ کردار وقت کی دُھند میں گم تھا لیکن اس ناول کے ذریعے یہ کردار پورے رنگ و آہنگ کے ساتھ ہمارے سامنے ہے وزیر خانم کو ۱۸۵۷ء کے بعد کے مقبول ترین اُردو شاعر مرزا داغ کی والدہ ہونے کا شرف حاصل ہے علامہ اقبال نے مرزا داغ کو 'آخری شہر جہاں آباد' کہا تھا کیونکہ ان کے ساتھ ہی کلاسیکی غزل کی ہماری عظیم روایات بھی اختتام پذیر ہوتی ہے اس کی شخصیت اور وجود کی وجہ سے ناول میں رومانی رنگ بھی ہے اور بیان کردہ واقعات کو مرکزی اہمیت بھی اس کی وجہ سے ملتی ہے۔

اس کے علاوہ غالب، شمس الدین، مارسٹن بلیک ولیم فریزر، داغ مرزا فخرو، بہادر شاہ ظفر، حکیم، احسن اللہ، ذوق اور باقی چھوٹے چھوٹے کردار اردو ادب کے اور ہندوستان کی اٹھارویں انیسویں صدی کے زندہ اور تاریخی کردار ہیں جو ادبی تاریخ کا حصہ بھی ہیں اور ان میں قلعے کی نامور ہستیاں بھی شامل ہیں۔ان کرداروں کے ذریعے اس دور کی معاشرت کی جھلکیاں ملتی ہے ہیں نہ صرف جھلکیاں بلکہ اٹھارویں، اُنیسویں صدی کا پورا معاشرہ آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور ہم اِس میں اپنے آپ کو چلتا پھرتا محسوس کرتے ہیں۔

'غلام باغ' کے تمام کردار اپنے موضوع کے حوالے سے عمدہ ہیں اس میں چار کردار جو مرکزی حیثیت کے حامل ہیں جن میں کبیر، زہرہ، ناصر اور ہاف مین شامل ہیں۔ بظاہر تو یہ کردار حقیقی نہیں اور نہ ہی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں لیکن اگر آج کے دور میں دیکھیں تو تاریخ کے معنی بدل گئے ہیں تاریخ ضروری نہیں کہ بڑے لوگوں کی ہو بلکہ عام انسان کی بھی تاریخ ہوتی ہے اور تاریخ کا تعلق ماضی سے نہیں بلکہ حال بھی تاریخ ہے تو اس حوالے سے یہ کردار بھی تاریخی ہیں 'غلام باغ' چونکہ استعارہ ایک ایسے ملک کا جو استعماری شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ ملک یقیناً پاکستان ہے۔امجد طفیل اس بارے میں کچھ یوں وضاحت کرتے ہیں:

> ''غلام باغ ایک حقیقی جگہ ہے جہاں صدیوں کے آثار تہہ در تہہ موجود ہیں اور ایک کیفے کے ذریعے یہ زمانہ حال سے جڑا ہوا ہے اور اس کیفے میں 'کبیر' اور 'ڈاکٹر ناصر' کے کردار کائنات کے آغاز میں کھڑے ہیں۔ تعمیر و تخریب کا عناصر ان کرداروں سے یوں جڑے ہوتے ہیں کہ ہمیں بیک وقت چیزیں بنتی اور ٹوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔ رشتے ایک تکون کی صورت میں موجود ہیں لیکن یہ ایک ایسی تکون ہے جس کا ایک زاویہ ہمیشہ

چھوٹا پڑ جاتا ہے۔ ناول کا محل وقوع شہر لاہور ہے جو اپنے تہذیبی اور سماجی معنویت کے ساتھ ناول میں موجود ہے لیکن اصل جگہ جہاں واقعات تشکیل پاتے ہیں۔ وہ غلام باغ ہے جو آثار قدیمہ کا عجائب گھر ہے جہاں صدیوں کے آثار تہہ در تہہ موجود ہیں اور آرکیالوجسٹ اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ اس جگہ سے موہنجو ڈارو اور ہڑپہ کا تہذیبی ورثہ بھی دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ 'غلام باغ' ارض پاکستان کی علامت میں ڈھل جاتا ہے۔''[۱۵]

اس طویل اقتباس سے اس ناول کا دائرہ کا تعین ہوتا ہے اور اس میں موجود کردار آج کے دور کے حقیقی کردار ہیں جن میں کبیر کا کردار ایک باغی کا کردار ہے جو اس ساری صورت حال جس میں وہ زندگی گزار رہا ہے جو بظاہر آزاد ہے لیکن حقیقی طور پر غلامی کی زندگی گزار رہا ہے اس صورت حال میں اس کی باغیانہ سوچ اس کی ہذیانی گفتگو اس کی پھڑ پھڑاہٹ بالکل درست ہے اس کے ساتھ ساتھ باقی کردار جن میں یاور عطائی، امر جان نواب ثریا جان نادر جنگ یہ تمام کردار اپنے طبقے اور ترجیحات سے مکمل کردار ہیں اور بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

چنانچہ 'کئی چاند تھے سر آسماں' کے کردار ہیں تو تاریخی جو یقیناً اپنی جگہ مسلم ہیں مگر 'غلام باغ' کے کردار فرضی ہونے کے باوجود ہمیں اپنے ارد گرد کی دنیا سے زیادہ حقیقی محسوس ہوتے ہیں اور تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ وزیر خانم اور زہرا کے کردار میں مماثلت ہے دونوں کردار ناول میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اگر وزیر خانم کو دیکھیں تو پورا ناول اسی کی زندگی کے گرد گھومتا ہے اور اٹھارویں انیسویں صدی کی پوری تصویر اسی کی وجہ سے ہمارے سامنے ہے بنی ٹھنی کی پر اسراریت میں بھی وزیر خانم کی موجودگی ہے اور اس کی زندگی میں جتنے بھی مرد آئے وہ ایک تو بہت اہم شخصیات کے مالک تھے اور پھر تمام کے تمام وزیر خانم کی محبت میں پوری طرح ڈوبے حسن و جمال میں کھوئے ہوئے تھے مارسٹن بلیک جیسا انگریز بھی اس کے حسن کی غلامی کرتا ہے اور اسے دیکھتے ہی اِس پر فریفتہ ہو جاتا ہے شمس الدین جیسا نواب بھی پوری طرح اس کے سحر میں گرفتار ہے جب وہ فریزر کے ہاں پارٹی میں جاتی ہے تو وہ دیکھتے ہی اس کے حسن کے سامنے ہار مان جاتا ہے۔ اس کے حسن میں کے سحر میں گرفتار نواب کے یہ جملے دیکھیں:

''ہمارے لیے آپ رازوں کا پر اسرار دریا ہیں وزیر خانم ہم بے سہارا آپ کے دریائے حسن سے اور اپنے دریائے شوق میں بہے جاتے ہیں۔''[۱۶]

پھر مرزا فخرو کو دیکھیں تو اگرچہ عمر میں اس سے بہت چھوٹا ہے اور پھر اس وقت وزیر خانم چار بچوں کی ماں بھی تھی اور زمانے کے حوادث نے بھی اس کے حسن کو متاثر کیا تھا اس کے باوجود مرزا فخرو بھی اس کے سحر میں گرفتار ہوتا چلا گیا اور آخر اپنے محل کی ملکہ بنا دیا چنانچہ وزیر خانم پورے ناول پر چھائی ہوئی ہے اور اپنے دور کے تمام اہم مردوں کو اپنے سحر میں گرفتار کیا ہوا ہے۔

اسی طرح 'غلام باغ' کا نسائی کردار زہرہ بھی انہیں خوبیوں کی مالک ہے۔ زہرہ اس ناول میں مرکزی حیثیت رکھتی

ہے اس کے سحر انگیز حسن نے اس ناول میں موجود تمام مرد کرداروں کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے اور کوئی بھی اس سے آزاد نہیں ہوسکتا ہے وہ اپنے ماضی کے بارے میں جاننا چاہتی ہے اور اسے ماضی کی کھوج اور اپنی شناخت کی تلاش اُسے کبیر ہاف مین اور ڈاکٹر ناصر (جو اس ناول کے بنیادی تین کردار ہیں) کے گروہ کا حصہ بنا دیتی ہے زہرہ کا حسن بھی وزیر خانم کی طرح بے پناہ تخریبی قوت رکھتا ہے۔ امجد طفیل اس بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ تخریبی قوت ہاف مین کو نامردی کے قریب لے جاتی ہے کبیر کو موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے اور ڈاکٹر ناصر کو اخلاقی اعتبار سے کھوکھلا بنا دیتی ہے۔''[۱۷]

زہرہ ناول میں موجود تمام مردوں ہاف مین جو کہ انگریز آرکیالوجسٹ ہے اسے زہرہ سے عقیدت ہے اور وہ اسے ملکہ صبا کہتا ہے اپنی دوست گرٹر کو اس کی وجہ سے نظر انداز کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ زہرہ سے بہت زیادہ نفرت کرتی ہے۔ناصر کو زہرہ سے عشق ہے اور اس کی یہ کیفیت آخر تک برقرار رہتی ہے جبکہ کبیر اس سے مسحور ہے کبیر اور زہرا مقناطیسی کشش رکھتے ہیں یہ دونوں ایک دوسرے کو تسخیر کرنا چاہتے ہیں زہرا اپنے حسن و بے باکی سے اور کبیر لفاظی سے گویا زہرہ پورے ناول میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے اسی لحاظ سے اس کی مماثلت وزیر خانم سے واضح ہے مگر مجموعی طور پر دیکھیں تو وزیر خانم کا کردار زیادہ جاندار ہے اس کی وجہ سے یہ ہے کہ ہر کردار زمینی اور حقیقی ہے جبکہ زہرہ کا کردار زمینی نہیں لگتا اس میں عام عورتوں کی طرح خصوصیات نہیں اس کی باتیں اس کی بے باکی وغیرہ روز مرہ زندگی میں اتنی اہمیت نہیں رکھتی اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ 'غلام باغ' پورا ناول ہی لایعنیت پر مبنی ہے اس وجہ سے اس کردار میں بھی لا یعنی اور تحیر موجود ہے چنانچہ واقعات و حالات کے لحاظ سے یہ کردار بھر پور ہے دونوں کردار اپنے عہد اور موضوع کے حوالے سے بھر پور اور مکمل ہیں۔

'کئی چاند تھے سر آسماں' کے کردار اس دور کے تاریخی کردار ہیں اور اپنے عہد اور موضوع کے اعتبار سے موزوں ہیں جبکہ 'غلام باغ' کا عہد اور موضوع نو آبادیاتی دور سے شروع ہوتا ہے اور آج تک محیط ہے اور اس میں نو آبادکاروں نے نو آبادیاتی باشندوں کی زندگی ان کی تہذیب و ثقافت پر گہرا اثر ڈالا اور اس اثر کی بدولت وہ آج بھی غلام ہیں وہ اضطراب کی کیفیت میں ہیں اسی لیے ناول کے تمام کردار نارمل اور عام انسان کی طرح نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی زندگی لایعنیت، تحیر ہے اور کچھ بھی ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا نو آبادکار کی دنیا مقامی باشندوں کی دنیا کو خارج کرنے کے اصول پر قائم ہوتی ہے اور وہ اپنی شخصیت، ثقافت، علمی ورثے اپنے سیاسی نظریات اپنے فنون کے بارے میں جو آرا پھیلاتا ہے وہ نو آبادیاتی دنیا کے افراد کی شخصیت ثقافت علم وفنون کے متعلق موجود آرا کے متضاد اور انہیں بے دخل کرنے والی ہوتی ہیں اور مقامی باشندوں کے پاس چونکہ اقتدار نہیں ہوتا اس لیے وہ نو آبادکار کی دنیا کے اوصاف کو خارج نہیں کر سکتی اور وہ اضطراب اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر ناصر عباس نیر:

''اپنی اس محرومی کا ادراک نو آبادتی دنیا دو صورتوں میں کرتی ہے محرومی کے خاتمے کی صورت میں اور محرومی

کے سبب کی صورت میں پہلی صورت میں وہ نو آباد کار کی دنیا کو جذب کرنے کی کوشش کرتی اور دوسری صورت میں وہ نو آباد کار کو اپنی محرومی کا سبب سمجھتی ہے اور اس کے خلاف بغاوت کا تصور کرتی اور شاذ و نادر مظاہرہ کرتی اور اپنی باز یافت پر مائل ہوتی ہے مگر سب صورتوں میں وہ نو آباد کی دنیا کے اخراج سے قاصر رہتی ہے۔''[۱۸]

یہ ناول چونکہ نو آبادیاتی پس منظر میں لکھا گیا ہے اور نو آبادیاتی نظام سے نکلنے کے بعد آج جو صورت حال ہے یہاں کے لوگوں کی اسی کیفیت کا بیان اس میں ملتا ہے اس لیے اس ناول کے تمام کردار بھی نو آبادیاتی اثر میں ہیں ان میں بعض کردار جنھوں نے انگریز نو آباد کاروں کی دنیا کو جذب کیا وہ نواب ثریا جاہ نادر جنگ، امبر جان، نجم الثاقب وغیرہ جیسے کردار بن گئے اور جنھوں نے اس کے خلاف بغاوت کے وہ کبیر زہرہ اور ڈاکٹر ناصر بن گئے چنانچہ کردار کے حوالے سے دیکھا جائے تو 'غلام باغ' کے کردار اپنے عہد اور موضوع کے حوالے سے بالکل مکمل اور عمدہ ہیں اگرچہ بظاہر ان کی گفتگو میں ربط و تسلسل نہیں انتشار ہے بے ربطگی ہے اضطراب ہے یہ اور ان کی گفتگو بعض اوقات بالکل بے معنی ہو جاتی ہے لیکن یہی تو خوبی ہے اس ناول کی اس کے تمام کردار اور فضا اس عہد اور موضوع کے حوالے سے اپنی جگہ درست اور مکمل ہیں۔

اگر ہم لسانی اعتبار سے دونوں ناولوں کا جائزہ لیں تو 'کئی چاند تھے سر آسماں' ایک عمدہ ناول ہے اس ناول میں جس عہد کو موضوع بنایا گیا اسی زبان کا استعمال کیا گیا ہے یعنی اس ناول میں اٹھارویں انیسویں صدی میں مستعمل زبان کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور تاریخی اعتبار سے دیکھیں اس ناول میں زبان کی ساری وہ سطحیں استعمال ہوئی ہیں جن کو جانے بغیر ہندوستان کے تاریخی عہد کا مرقع کھینچا ممکن نہیں تھا جس میں تمام ادبی شخصیات سانس لے رہی تھیں۔ ڈاکٹر منصور احمد قریشی 'کئی چاند تھے سر آسماں' زبان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس ناول میں زبان و بیان مکالموں کرداروں اور بیانیہ گفتگو میں اس عہد کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور ایسا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا گیا جو اس عہد میں مستعمل نہ تھا۔''[۱۹]

ناول کا ہر پہلو نمایاں ہے ناول نگار کا مزاج اور میلان بھی مختلف مزاجوں اور رنگوں کو سمجھنے سمجھانے کا رہا ہے مزید برآں ناول کا بھی یہی تقاضا تھا کہ اس دور کی زباں لہجے اور طرز تخاطب کو برتا جائے بے شمار الفاظ محاورے، ضرب الامثال جو اس زمانے کی گرد فراموش کاری میں دفن ہو چکے تھے ان کی بازیافت کی گئی ہے۔

اس طرح بے شمار محاورے اور ضرب الامثال ایسے ہیں جن پر فی زمانہ مغائرت کی چھاپ نظر آتی ہے ہر صفحہ پر کئی کئی الفاظ انجان اور غیر مانوس دکھائی دیتے ہیں لیکن عہد قدیم میں جو الفاظ مستعمل رہے ہیں اور ناول کے واقعاتی سیاق و سباق کے ذریعے ہم ان کے معنی و مفہوم تک پہنچ جاتے ہیں۔ مظہر جمیل 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' کی لفظیات کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''کئی چاند تھے سر آسماں' کا گلوسری لفظیات کا خصوصی مطالعہ ضروری اور مفید ہوگا کہ ہر عہد کی تہذیب اپنے ماضی الضمیر کو مروجہ لفظیات کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔'' [۲۰]

اگرچہ 'کئی چاند تھے سر آسماں' کی زبان عہد موضوع اور کرداروں کے حوالے سے مستند ہے اور یہ بلاشبہ بہت مشکل کام ہے جس کو احسن طریقے سے نبھایا گیا ہے لیکن یہ خوبی اس ناول کی خامی بھی بن گئی ہے مسئلہ یہ ہے کہ عام قارئین کو چھوڑیں خود اردو کے شاعروں اور ادیبوں میں کتنے لوگ ہیں جو اس زبان کو ناول کی مطلوبہ روانی کے ساتھ پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں بہت کم ناول کو پڑھنے اور زبان کو سمجھنے کے لیے لغت کا سہارا لینا پڑتا ہے لیکن یہ خوبی اور خامی ایک دوسری سطح پر چیلنج بھی بنتی ہے کہ اس ناول کے ذریعے اردو کی بنیاد تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

'غلام باغ' کی زبان کے حوالے سے بات کی جائے تو بظاہر اس کی زبان بہت سادہ ہے لیکن حقیقتاً اس میں بہت پیچیدگی پائی جاتی ہے اور ناول کے مجموعی 'ڈیزائن کے نقطہ نظر سے اسے دیکھا جائے تو یہ ایک توانائی حاصل کر لیتی ہے جو کہ روایتی زبان میں تلاش کرنا مشکل ہے۔عبداللہ حسین ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے اس کی زبان کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''کہتے ہیں فکشن میں زبان کا مخصوص استعمال بھی ایک کردار کی حیثیت رکھتا ہے مرزا کی زبان یوں تو عام فہم لگتی ہے مگر ناول کے مکمل ڈیزائن میں رکھ کر دیکھیں تو اس میں ایسی تنومندی دکھائی دیتی ہے جو روایتی زبان و بیان کی قدرت میں نہیں پائی جاتی۔''[۲۱]

چنانچہ ناول کی زبان کے حوالے سے بھی ہمیں دلچسپ صورت حال ملتی ہے ناول کے بعض حصوں میں زبان کو ایک خاص نوع سے تشکیل دینے کی کوشش کی گئی ہے شاید کسی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ ادبی تھیوری میں ساختیت اور پس ساختیت کے مباحث سے ناول نگار نے اثرات قبول کیے ہیں اور زبان کی نئی تشکیل کی ہے۔

ناول میں ایسے مقام آئے ہیں جہاں زبان اپنا مقصود خود بن جاتی ہے اور ناول کا بیانیہ ٹھہرا ہوا نظر آتا ہے زبان کا یہ استعمال فکشن کی جدلیات میں سلسلہ واقعات کو آگے بڑھانے کی بجائے روکتا ہے جیسے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بیوروکریٹ کے کمرے میں بھی جگہوں کے احساس منطق کے عمل دخل کا قائم و دائم ہے جو عمل قائم دخل دائم، عمل دائم، دخل دائم، عمل دائم، دخل قائم دخل، دائم عمل ، دائم دخل، دائم قائم دخل عمل دخل دخل، عمل عمل، دائم دائم، قائم قائم۔

..... اس دائم دائم سطح پر جو اشیاء سب سے زیادہ قائم قائم ہیں وہ تین ٹیلی فون ہیں جن میں کوئی کسی بھی، دائم قائم کے لمحے میں بج پڑتا ہے۔تو سائل یا سائلوں میں کچھ دخل دائم ہو جاتے ہیں پھر وہ ایک دائم عمل، احساس کے ساتھ سنتا ہے اور دائم دخل لہجے میں بات کرتا ہے تو کچھ اور سائل دخل دخل سے ہو کر قائم دخل

ہو جاتے ہیں۔''[۲۲]

زبان کے ساتھ یہ برتاؤ یقیناً انوکھا ہے اور صرف یہیں پر نہیں بلکہ اس کی کئی اور مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جہاں معلوم ہوتا ہے کہ ناول نگار زبان کے ساتھ کھیل رہا ہے اور ناول میں زبان زندہ کردار میں تبدیل ہو رہی ہے۔

زبان کے ساتھ ایک خاص قسم کا برتاؤ اُن مقامات پر بھی ملتا ہے جہاں کبیر بے معنی ہذیان زدہ خیالات کا بیان ہے۔ اس طرح بعض جگہ زبان میں موجود ابہام کے عنصر کے ذریعے کرداروں کے درمیان ہونے والے مکالموں کی بے معنویت کو آشکار کیا گیا ہے یہ لسانی برتاؤ بہت قوت کے ساتھ 'غلام باغ' میں ملتا ہے جو یقیناً اہمیت کا حامل ہے۔عارف وقار 'غلام باغ' کی زبان پر یوں بحث کرتے ہیں:

> ''اگر آپ بیسویں صدی کے دوران فکشن میں ہونے والے مختلف النوع تجربات سے آگاہ ہیں تو 'غلام باغ' کی نثر اور اس کے بیانیے کی بنت آپکو اجنبی محسوس نہیں ہوگی اور ذرا سا غور کرنے پر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مصنف نے زبان کی ان مجبوریوں، پابندیوں اور کم مائیگیوں کے چیلنج کو قبول کیا ہے جو کسی بھی غیر روایتی فکر اور نادر طرز ادا کے راستے کی دیوار بن سکتی ہیں اور پھر روایتی زبان کے سانچے میں رہتے ہوئے غیر روایتی بات کر کے دکھائی ہے۔ زبان و بیان کا یہ سارا کھیل اپنے جوہر میں لمحہ موجود کو گرفت میں لینے کا کھیل ہے۔''[۲۳]

چنانچہ دونوں ناول زبان کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔'کئی چاند تھے سر آسماں' کی زبان اس دور اور عہد کی زبان ہے جس میں ناول تخلیق ہوا اور یہ عہد اٹھارویں، انیسویں صدی کا مغل حکومت کا زوال پذیر دور ہے اور اس میں اس دور کے مستعمل الفاظ ملتے ہیں اور ناول نگار کا زبان پر مکمل عبور ہے اس زبان کو استعمال کرنے کے لیے لغات کا سہارا بھی لیا گیا ہے جہاں اس کے ذریعے اُس عہد کی زبان کی باز یافت کی گئی ہے اور ہم اس عہد کی زبان سے واقفیت حاصل کرتے ہیں وہاں اس کو سمجھنا بھی بہت مشکل ہو گیا ہے اور عام قاری تو کیا ادب کی بڑی شخصیات کے لیے بھی لغات کے سہارے کے بغیر اس زبان کو سمجھنا مشکل لگتا ہے۔

اسی طرح 'غلام باغ' کی زبان کو دیکھیں تو یہ اپنے موضوع کے اعتبار سے موزوں ہے کیونکہ اس ناول کا موضوع نو آبادیاتی باشندوں کا اضطراب انتشار اور پھڑ پھڑاہٹ کی کیفیت کا بیان ہے تو اس صورت میں زبان کی یہ لایعنیت اور جذباتی کیفیت انوکھی نہیں بلکہ اپنی جگہ بالکل درست اور مکمل ہے۔لیکن اس کا فلسفیانہ انداز عام قاری کی سمجھ سے بہت بالا تر ہے۔ چونکہ ناول نگار فلسفہ کا استاد ہے اس نے تاریخی اور تہذیبی عناصر کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا ہے اور اس کی فلسفیانہ سوچ ، فلسفیانہ الفاظ ناول میں حد درجہ زیادہ ہیں جس نے اس کی زبان کو مشکل بنا دیا ہے اور یہ فلسفیانہ انداز بعض جگہ بہت ابہام اور اپسرڈی لیے ہوئے ہیں اور یہی چیز اس ناول کی مقبولیت میں کمی اور خامی کا سبب بن سکتی ہے۔

ان تمام خوبیوں خامیوں کے باوجود دونوں ناولوں کی زبان اپنے موضوع کے حوالے سے بالکل موزوں ہے اور

لسانی اعتبار سے کئی نئی پرتیں کھولتی ہے۔واقعات کے حوالے سے دیکھیں تو 'کئی چاند تھے سر آسماں' اور 'غلام باغ' دونوں ناولوں میں بہت سے واقعے ہیں جو تاریخی حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں دونوں ناولوں کے واقعات میں تاریخ کا کڑوا تصور ملتا ہے ریشمی لباس کے پیچھے بھدا پن اور سفاکی ملتی ہے۔ماضی ہو یا حال بالائی طبقے کے لوگ زینہ چڑھنے کے لیے خوشامدیں کرتے ہیں اپنے اقتدار اور مرتبہ کے حصول کے لیے اخلاقی طور پر گراوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں ان کا طریقہ کار ایک ہی ہے۔

'کئی چاند تھے سر آسماں' میں جس معاشرت کی جھلک ملتی ہے وہ ایک خاص نوابی معاشرہ ہے اس میں مسلمان حکومت کا خاتمہ ہو رہا ہے اور اس کی جگہ استعماری قوتیں لے رہی ہیں۔ یہ ہند اسلامی تہذیب کے عروج نہیں بلکہ اس کی خاکستر ہوتی ہوئی تہذیب کی فضا کا شہر آشوب ہے جس کی عمارت تاریخی اور دستاویزی شہادتوں کی بنیاد پر استوار کی گئی ہے۔

اس دور میں وزیر خانم جیسی عورتیں معاشرے کا ایک اہم اور فعال طبقہ تھیں جنہیں نام نہاد تہذیبی علامت کا درجہ بھی حاصل تھا ان کا شمار طبقہ نشاط اور طوائفوں میں نہیں ہوتا تھا بلکہ اشرافیہ کے تہذیبی نظام نے اس کو طبقاتی سطح پر قدرے قبولیت کی سند دے رکھی تھی 'بن نکاحی' بیویاں عام طور پر عام 'نکاہی' بیویوں کے ہم پلہ تو نہ تھیں لیکن اس معاشرتی منصب کی عدم موجودگی میں بھی یہ خوش فہم مخلوق کم و بیش ویسی ہی تمکنت کا اظہار کرتی تھیں جو منکوحہ بیویوں کا مقدر ہوا کرتا تھا زیادہ تر نوابین اور رؤسا کے اخلاف میں ان کی اولادوں کو وہ عزت و مرتبہ تو نہ ملتا تھا جو منکومہ بیویوں کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں کو تھا البتہ ان کی تربیت عام شرفا کے بچوں کی طرح ہوتی تھی جائیداد اور وراثت کا معاملہ بھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا تھا لیکن یہ بات کم تو نہیں تھی کہ باپ کا نسبی تعلق غیر قانونی ازواج کی حامل اولاد کو بھی حاصل تھا۔

ہندوستانی نواب و رؤسا تو کیا انگریز حکومت کے چھوٹے بڑے لوگ افسر بھی اسی معاشرتی اور اخلاقی صورت حال سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ہر انگریز ایک نہیں بلکہ چھ چھ ہندوستانی بی بیاں رکھتا تھا۔اختر لونی کے حرم میں گیارہ ہندوستانی بیبیاں تھیں اس طرح ولیم فریزر کئی کئی بیویوں پر تصرف رکھتا تھا اور امرد پرستی کا شوق اس پر مستزاد تھا غرض ناول میں جن انگریز حکمرانوں اور افسروں کے تذکرے آتے ہیں ان سب کی بابت بالعموم بات طے تھی کہ متعدد جنسی عیاشیوں کے علاوہ ہندوستانی عورتوں کا طبقہ ان کے تصرف میں رہتا تھا جن سے اولادیں بھی پیدا ہوتی تھیں لیکن یہ اولادیں قانونی وراثت سے محروم ہی رہتیں۔جیسے ناول میں فاروقی نے لکھا ہے:

> ''بیبیاں سب بیبیاں ہیں ہندو یا مسلمان کم ذات یا اعلیٰ، تعلیم یافتہ یا اہل حرفہ ایسی کوئی تہہ نہیں نہ تعداد کی کوئی شرط ہے، پھر سب کا مرتبہ آپس میں برابر ہے اس فرق کے ساتھ کہ جس بی بی کا صاحب جتنا بڑا آدمی ہوگا، اتنی ہی بلند حیثیت اس بی بی کی ہوگی اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کم ذات بیبیوں کو چھوڑ کر بہتر بی بی کر لی جاتی اور پرانی بی بی اپنے نطفے اور اس کے بطن کی اولاد کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا اگر کوئی انگریز اپنی بی بی کے حق میں اعلان بھی کر دیتا یا بیان کرتا کہ یہ میری منکومہ یا 'بیوی' ہے تو بھی انگریزی قانون اور کمپنی

ضوابط میں ایسی شادی کے کچھ معنی نہ ہوتے ان کے نزدیک شادی وہی درست تھی جو عیسائی رسوم کے مطابق ہو یا جسے کمپنی کی منظور شدہ انگریزی عدالت کے سامنے انجام دیا گیا ہو اور افسر عدالت کے دستخط اور گواہیاں نکاح نمامے پر ثبت ہوں لیکن انگریزوں کی نکاحی بیویوں کا بھی اپنی اولاد پر کوئی خاص دعویٰ یا حق نہ ہوتا تھا حد سے حد یہ ہوتا کہ ان کے دو نام رکھے جاتے ایک عیسائی اور ایک ہندوستانی ہندو یا مسلمان بچوں کی تربیت کا بیشتر حصہ فرنگی اصولوں پر کیا جاتا اگر تو سات آٹھ برس کا ہونے پر بچے (لڑکا یا لڑکی) کو ماں سے بحریا اس کی مرضی سے ولائت روانہ کر دیا جاتا۔ ایسی صورت میں اگر اولاد ہندوستان واپس آتی یا اپنی ماں کے بارے سب کچھ معلوم ہوتا تو شاید ماں کو ڈھونڈ نکالے ورنہ دونوں دنیائیں میں الگ تو ہو چکی تھیں بیچ میں کالا پانی حائل ہو یا نہ ہو۔''[۲۴]

غرض اس معاشرے کے سب ہی صاحب اختیار و اقتدار لوگ عورتوں کے بارے میں یکساں ظالمانہ رویے کے کامل تھے وزیر خانم جیسی خوش نصیب عورتیں تو خال خال ہی ہوں گی جنہیں نواب شمس الدین نے مستقل جائیداد کا قبالہ لکھ دیا تھا لیکن وراثت اور ترکے میں وہاں بھی کوئی گنجائش نہ تھی یہاں تک کہ ان سے پیدا ہونے والی اولاد تک حق تو ریت سے محروم رہی اور نواب مرزا داغ دہلوی فیروز پور و لوہارکی جاگیروں سے ایک حصہ بھی پانے کے حق دار نہ سمجھے گئے۔

خود نواب شمس الدین جس کی والدہ ایک میواتی خاتون تھیں جن سے نواب احمد بخش والی فیروز پور و لوہار نے بعد میں نکاح بھی پڑھوالیا تھا لیکن فرزند اکبر ہونے کے باوجود ان کی ولی عہدی کا استحقاق آخر وقت تک باعث نزاع رہا کہ ان کی والدہ غیر کفو اور ان کی پیدائش کے وقت بن نکاہی تھیں ان کے سوتیلے بھائیوں کو جو ان پر فوقیت تھی وہ واحد اسی سبب تھی۔

اس ناول میں ہم دیکھتے ہیں کہ وزیر خانم کے باپ کی شادی ایک ڈیرے دارنی اکبری کی بیٹی سے ہوئی لیکن یوسف اور اس کی بیوی دونوں مذہبی اور شریف تھے منجھلی بیٹی عمدہ بیگم جب نواب یوسف علی خان کے متوسلین میں شامل ہوئی تو یوسف سادہ کار پر یہ بات گراں گزری لیکن وزیر خانم کے مارسٹن بلیک کے ساتھ چلے جانے پر باپ کی نیم رضا مندی بھی شامل رہی ہے ناول اس معاملے میں زیادہ تفصیلات تو فراہم نہیں کرتا لیکن بین السطور معاشرتی اور اخلاقی دوغلے پن کے عناصر صاف نظر آتے ہیں۔

گویا منافقت اور ظاہر داری اس عہد کے نمائندہ کردار تھے۔ اسی طرح جب آغا مرزا تراب علی سے وزیر بیگم کے نکاح مرحلہ آتا ہے تو اس وقت داغ دس گیارہ سال کا تھا تو اس کا یہ کہنا کہ بے شک ماضی کے سائے میں زندگی گزارنا ممکن نہیں اس لیے ماں کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنی آئندہ زندگی میں نکاح یا کوئی اور ایسی صورت، جو مناسب خیال کرتی ہو اختیار کر سکتی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں اس طرح کے چلن کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اسی طرح ایک اور اہم بات سامنے آتی ہے کہ ہمارے طبقے کے امراء اور شرفا نے شروع ہی سے کس طرح انگریزوں

کی خوشامدیں بھی کیں عہدہ اور مرتبہ حاصل کرنے کے لیے وہ اخلاقی طور پر نچلی سطح پر کھڑے نظر آتے ہیں۔شمس الدین کے والد نواب احمد بخش نے ایک انگریز کی جاں بچائی اور اس کے صلے میں لارڈ لیک نے فیروز پور جھرکہ اور سانگرس کے اضلاع بطور خاص جاگیر عطا کی اور فخر والدولہ، دلدورا الملک 'رستم' کے ساتھ سند دی اس طرح وہ والی ریاست ہوئے۔

احمد بخش خاں کی انگریز پرستی اور خوشامدی طبیعت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بلی ماراں میں جو نئی حویلی بنوائی اس پر اپنا یا اپنے خاندان کے کسی فرد کا نام لکھوانے کے بجائے 'حویلی جمیس اسکنر صاحب بہادر' کندہ کرایا۔خاندان لوہا دور کے لوگ غالبؔ سے رشتہ داری کا ذکر بڑے فخر سے کرتے تھے کیونکہ اسی کی بیوی ان کے خاندان سے تھی۔اس بارے میں علی حیدر ملک کا کہنا ہے:

> ''نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش معروف کی بیٹی امراؤ بیگم مرزا غالب کو بیاہی تھیں لیکن اس کے باوجود انگریزوں کی ہدایت پر غالب کو پانچ ہزار روپے سالانہ وظیفہ جو ملتا تھا نواب احمد بخش نے خواجہ حاجی نامی ایک فرد مجہول کو اس میں سے ہزار روپے کا حصہ دار بنا دیا احمد بخش نے خواجہ حاجی کو یہ انعام اس لیے دیا تھا کہ اس نے غالب کے چچا مرزا نصیر اللہ بیگ خان کے انتقال کے بعد ان کا مال و اسباب لوٹ کر احمد بخش خان کی نذر کر دیا تھا۔''[۲۵]

اس اقتباس سے بھی ان کی اخلاقی برائیوں کا پتہ چلتا ہے پھر فتح اللہ بیگ، فریزر کے قتل کے بعد غالب کے ساتھ سب سے پہلے پہنچنے والوں میں تھا اور جھپٹ کر لاشے پر گرا اور نعرہ لگایا۔

> ''ہائے شمس الدین نے تجھے نہ چھوڑا''[۲۶]

یہ واقعہ فریزر کے قتل کو نیا رخ دینے والا تھا اس میں صرف انگریز پرستی ہی وجہ تھی ورنہ یہ شمس الدین کے رشتہ میں بھائی تھا اور کوئی ذاتی دشمنی بھی نہ تھی۔یہ تمام واقعات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ امراء اور شرفا کے طبقہ نے اپنے اقتدار حاصل کرنے کے لیے انگریزوں کی خوشامدیں کیں انہیں اپنی عورتیں پیش کیں۔ یہاں ہر طرف ترجیحات کا معاملہ ہے اور اخلاقی طور پر انتہائی گرے ہوئے لوگ ملتے ہیں۔

غلام باغ میں بھی جن بڑے طبقہ کے لوگوں کا ذکر ملتا ہے وہ اخلاقی طور پر بہت پست ہیں وہ بھی اقتدار اور جاہ و مرتبہ اور اپنی جنسی خواہش جو انسان کی جبلی خواہش ہے اس کو پورا کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ اس میں چاہے امر جان ہو یا نجم الثاقب، نواب ثریا جاہ نادر جنگ ہو یا غیاث پگل اپنی ترجیحات کے لیے انسانی درجے کی سطح سے بہت نیچے گر جاتے ہیں۔

دونوں ناولوں میں ایک ہی چیز کا بیان جلتا ہے کہ چاہے ماضی ہو یا حال ہو ہمارے امراء اور شرفا نے کامیابی اور بلندی زینہ چڑھنے کے لیے اپنی عورتیں انگریزوں کو پیش کیں اور وہ راستہ اپنایا جو ان کو شرفا کی صف میں شامل کر سکے

بظاہر یہ لوگ شرفا اور امراء کی صف میں شامل ہیں لیکن حقیقتاً یہ انتہائی رزیل اور اخلاقی طور پر بہت گرے ہوئے لوگ ہیں۔ بالائی طبقہ کے لوگوں کے ریشمی لباس کے پیچھے بعد امن سفائی اور ذلالت چھپی ہوئی ملتی ہے۔ دونوں ناولوں کا اس موضوع پر ایک ہی نقطہ نگاہ ہے اور یہی ان میں مماثلت بھی ہے۔ 'کئی چاند تھے سر آسماں' میں اٹھارویں، اُنیسویں صدی کے عہد کے شرفا کی اخلاقی برائیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ 'غلام باغ' میں اس دور سے لے کر آج کے وقت تک کے بالائی طبقہ کے لرزیل ہونے کا ذکر ملتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور اہم بات قابل ذکر ہے جو ان دونوں ناولوں میں مماثلت رکھتی ہے اور تاریخی تقابل کے حوالے سے ایک اور چیز تاریخی تقابل کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے وہ یہ کہ امراء شرفاء اور بالائی طبقے کے لوگ چاہے وہ 'کئی چاند تھے سر آسماں' کے عید کے نواب ہوں یا 'غلام باغ' کے آج کے عہد کے امبر جان جیسے لوگ ہوں ان کی جنسی بھوک ایک جیسی ہے۔ جنسی تسکین جو انسان کی جبلت میں شامل ہے اس کا بھر پور ذکر دونوں ناولوں میں لیا گیا ہے۔ مرد کی جبلی بھوک 'عورت' ہی ہے اور اس کی اس بھوک کا تذکرہ دونوں ناولوں میں موجود ہے تاہم 'غلام باغ' میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ یاد عطائی جو ازل نسل سے تعلق رکھتا ہے اپنے زدیل ہونے کا بدلہ اس اونچے طبقے سے اس طرح لیتا ہے کہ انہیں اپنے سامنے ننگا کر دیتا ہے اور ان کی سب سے بڑی کمزوری کو قابو کرتا ہے اور اس طرح اپنے خاندان کا بدلہ لیتا ہے۔

اسی طرح 'ٹھگوں' کا کر دونوں ناولوں میں آیا ہے ٹھگوں کے بارے میں تفصیل بھوانی رانی کی متھ بجائے خود ایک دلچسپ داستان ہے۔ 'کئی چاند تھے سر آسماں' میں اس کا بیان بہت تفصیل سے ملتا ہے جب مرزا آغا تراب سوں پور سے واپسی پر بہار کے ٹھگوں کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں اس وقت ناول میں دیوی بھوانی کی متھ اور اس کے پجاریوں کی ٹھگ بازیوں کی تفصیل ایک الگ اور اہم تاریخی و تہذیبی حوالہ بنتی ہے۔ اسی طرح 'غلام باغ' میں بھی ٹھگوں کا ذکر ملتا ہے کبیر کو یورپی مصنف کی ایک کتاب ملتی ہے جس میں ہندوستان کے ٹھگوں کے بارے میں اور ٹھگ بازی کی متھ کے بارے میں آگہی دی گئی ہے اور اس میں ہندو مسلم دونوں کا دیوی بھوانی کے بارے میں عقیدہ یکساں ملتا ہے یہاں مسلمانوں کے اعتقاد اور ان کے مذہب پر اس کے مذہب پر گہرا طنز بھی ملتا ہے اور مسلمانوں کے عقیدے پر سخت تنقید کی گئی ہے۔

دونوں ناولوں کا جائزہ لیں تو 'کئی چاند تھے سرِآسماں' میں ٹھگوں کی کہانی بہت تفصیل اور جامع انداز میں بیان ہوئی ہے اور وہ ایک دلچسپ داستان کی شکل اختیار کر لیتی ہے جبکہ 'غلام باغ' میں اس کا بیان زیادہ تفصیل سے نہیں اور اس میں صرف مسلمانوں کو مذہبی لحاظ سے طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی طور پر دونوں ناول تاریخی اعتبار سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ 'کئی چاند تھے سر آسماں' جس عہد کو موضوع بنایا گیا ہے وہ مائل بہ زوال تھا اس میں تاریخی شعور کی گہری کارفرمائی نظر آتی ہے اور مصنف جس عہد کی تاریخ و تہذیب کی جھلکیاں دکھا رہا ہے اس سے اسے مکمل آگہی ہے جبکہ '' غلام باغ'' میں تاریخی شعور کا بیان ہوا ہے اِس میں تاریخی

تصورات مبہم ہے مگر اِس کی یہی لایعنیت اِسے اُردو ناول میں اہم اور منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ دونوں ناول اُردو ناول کی گراں قدر اضافہ ہے۔ اِن ناولوں کی صورت میں جو موضوعاتی ، تکنیکی تجربے کیے گئے ہیں وہ یقیناً قابل ستائش ہیں اور آنے والے ناول کو باثروت بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ احمد مشتاق: کلیاتِ احمد مشتاق، الٰہ آباد: شب خون کتاب گھر، بار دوم،۲۰۰۴ء،ص ۱۶۱

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی: کئی چاند تھے سر آسماں، کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۶ء،ص ۱۶۷

۳۔ کئی چاند تھے سر آسماں،ص ۱۷۵

۴۔ مرزا اطہر بیگ: انٹرویو مقالہ نگار: رُخسانہ بی بی، لاہور: جی۔سی۔ یونیورسٹی،۲۳/ مارچ ۲۰۰۸ء، بوقت ۱۲:۱۰ ، دوپہر

۵۔ امجد طفیل: کئی چاند تھے سر آسماں،مشمولہ: روزنامہ اوصاف، سنڈے میگزین،۱۴/جنوری ۲۰۰۷ء،ص ۱۱

۶۔ مرزا اطہر بیگ: انٹرویو، روزنامہ ایکسپریس، لاہور: ۲۹/اکتوبر ۲۰۰۹ء،ص ۱۶

۷۔ سہیل احمد خان، ڈاکٹر: غلام باغ (فلیپ)، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء

۸۔ کئی چاند تھے سر آسماں،ص ۴۹۲

۹۔ مرزا اطہر بیگ: غلام باغ، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء،ص ۳۱۹-۳۱۶

۱۰ فیروز عالم: اُردو ناول کی تاریخ کا سنگ میل،مشمولہ: شب خون خبرنامہ، الٰہ آباد: فروری تا جولائی ۲۰۰۸ء،ص ۲۵-۲۶

۱۱۔ مظہر جمیل: غلام باغ کا تجزیاتی مطالعہ،مشمولہ: ماہنامہ ادبِ لطیف، لاہور: شمارہ ۱۲/ دسمبر ۲۰۰۸ء،ص ۲۹۴

۱۲۔ Razi Abadi: Writer Bloc: "*Theatre of the Absurd*" The nation, sunday, May 6, 2007, P 9.

۱۳۔ عبداللہ حسین: غلام باغ (فلیپ) لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، اشاعت دوم، ۲۰۰۷ء

۱۴۔ Razi Abadi: Writer Bloc: "*Theatre of the Absurd*" The nation, sunday, May 6, 2007, P:9.

۱۵۔ امجد طفیل: غلام باغ کا تجزیاتی مطالعہ، ماہنامہ ادبِ لطیف، لاہور: شمارہ ۱۲، دسمبر ۲۰۰۸ء،ص ۱۲۵

۱۶۔ کئی چاند تھے سر آسماں،ص ۲۶۴

۱۷۔ امجد طفیل: غلام باغ کا تجزیاتی مطالعہ،ص ۱۲۵

۱۸۔ ناصر عباس نیر: نو آبادیاتی کی صورتِ حال، مشمولہ: ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور زبان و ادب، مرتبین: ڈاکٹر ضیاء الحسن، ڈاکٹر ناصر عباس نیر، کلیہ علومِ شرقیہ، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۵-۲۶۴

۱۹۔ منصور احمد، ڈاکٹر: کئی چاند تھے سر آسماں کا تاریخی اور تہذیبی پس منظر، ادبی مجلّہ راوی، لاہور: گورنمنٹ کالج، ۲۰۰۸ء، ص ۴۲

۲۰۔ مظہر جمیل، سید: ص ۳۱۹

۲۱۔ عبداللہ حسین، غلام باغ (فلیپ)

۲۲۔ غلام باغ، ص ۵۰۸-۵۰۷

۲۳۔ عارف وقار: غلام باغ، اُردو ادب میں اہم واقعہ، بی بی سی ڈاٹ کام، لاہور: ۴/جنوری ۲۰۰۷ء، ص ۲۰۶۴

۲۴۔ کئی چاند تھے سر آسماں، ص ۱۷۷-۱۷۶

۲۵۔ حیدر علی ملک: کئی چاند تھے سر آسماں، مشمولہ، فیصل آباد: ماہنامہ نقاط، قاسم یعقوب (مدیر)، ص ۳۲۳

۲۶۔ کئی چاند تھے سر آسماں، ص ۴۶۴